© rasailojaraid.com

اسلام اور تھیاکریسی[1]

(عبد الحمید)

انسانیت نے جو کروٹ دورِ متوسط سے دورِ جدید میں آنے کے لیے لی وہ اپنے نتائج اور اثرات کے اعتبار سے نہایت ہی انقلاب انگیز ثابت ہوئی۔ مذہب کے خلاف ایک شدید جذباتی کشمکش نے، جو اس تبدیلی کی اصل محرک تھی، اس انقلاب کو خالص الحاد کے راستے پر ڈال دیا۔ تہذیب جدید کے معماروں نے کائنات کی بدیہی شہادتوں اور انسانی فطرت کی کھلی پکار کے باوجود مذہب اور اس کے جملہ لوازم مثلاً خدا، آخرت، حشر و نشر، وحی والہام کا انکار کرتے ہوئے انسانی تہذیب کی ساری عمارت کو الحاد پر استوار کیا۔ اخلاق کی وہ ساری قدریں جنہیں انسان ہمیشہ سے عزت و توقیر کی نظر سے دیکھتا رہا تھا وہ سب ملیامیٹ کر دی گئیں اور اب انسانیت نے اپنا سفرِ حیات یہ سوچ کر شروع کیا کہ دنیا کی تباہی اور بربادی کا اصل سبب صرف مذہب ہے۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ جو چیز بھی اس سے متعلق ہو اس کے بارے میں بغیر کسی تامل کے یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ سراپا "جہالت" ہے۔ اس ردعمل کا ایک ہدف "مظلوم" تھیاکریسی (THEOCRACY) بھی ہے۔ یار لوگوں نے اس لفظ کی تشریح و تفسیر مدتہائے دراز سے کچھ اس انداز میں کی ہے کہ اب یہ لفظ مذہبی دیوانوں کی "فرمانروائی" کا ہم معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کو سنتے ہی آدمی کی آنکھوں میں کچھ اس طرح کا نقشہ پھرنے لگتا ہے کہ چند جاہل مذہبی سرپھرے پُرغضب چہروں، چڑھی ہوئی تیوریوں اور شرر فشاں آنکھوں کے ساتھ مسندِ اقتدار پر قابض ہو گئے ہیں اور ان کا مقصدِ حیات صرف یہی ہے کہ معصوم اور بھولے بھالے عوام کو خدا اور آخرت کا نام لے لے کر ڈرائیں اور ان کے گاڑھے پسینے سے حاصل کی ہوئی کمائی کو ذاتی آرام و آسائش پر بے دریغ صرف کریں۔ ماہرین نے تھیاکریسی کی یہ تصویر بڑی فنکاریوں کے ساتھ

---

[1] اس لفظ کا ترجمہ عام طور پر "حکومتِ الٰہیہ" کیا جاتا ہے مگر چونکہ دونوں کے تصورات میں ایک نمایاں فرق ہے اس لیے ترجمہ دینے کی بجائے اس لفظ کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنائی ہے۔

لطف یہ ہے کہ اس تصویر کے بنانے والے ہمارے وہ مہربان ہیں جو خود صدیوں سے ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح ہو کر قزاقوں کی طرح کمزوروں کو لوٹتے رہے ہیں۔ جن کی تنگ نظری، زیادتی اور مردم آزاری نے آج پوری نوعِ انسانی پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہے۔ جن کی چیرہ دستیوں، تصادموں اور چالبازیوں کی پوری انسانیت نوحہ خواں ہے۔ مگر ان ماہرینِ فن کی مہارت قابلِ صد ستائش ہے کہ انہوں نے "مذہبی حکومت" کی تصویر اتنی بھیانک اور اتنی بڑی بنائی ہے کہ ان کی جمہوریت، اشتراکیت اور فسطائیت کی خوفناک تصویریں اس کے پیچھے چھپ گئی ہیں اور خود ہماری سادہ لوحی بھی قابلِ داد ہے کہ جب ہم غیروں کی بنائی ہوئی اس تصویر کو دیکھتے ہیں تو ایسے حواس باختہ ہو جاتے ہیں کہ ہمیں ان تنگ نظر مصوروں کو دیکھنے کا ہوش نہیں رہتا جنہوں نے محض مذہب اور اس کے نوامیس عالیہ کی تذلیل کے لیے یہ ساری تگ و دو کی ہے اور بڑی ہی لجاجت سے یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں "حضور! یہ مذہبی حکومت واقعی دنیا کے لیے بڑی آفت تھی۔ اس سے انسانیت کو ہمیشہ نقصان پہنچا، اس کے نظم کو چلانے والے یہ مذہبی پیشوا بڑے ہی جاہل تھے ان سے کبھی بھی کوئی مفید کام سرانجام نہ پایا۔ یہ لوگ نوعِ انسانیت کو ہمیشہ پیچھے کی طرف لے جانے کی کوشش کرتے رہے۔ ان لوگوں نے مذہب کے نام پر عوام کو لوٹا۔ حضور اب ہماری توبہ۔ ہماری کیا مجال کہ اب ہم ان مذہبی دیوانوں کو حکومت کے ایوانوں میں گھسنے دیں۔ ہمارے سامنے ہمارے ماضی کے قصے نہ دہرائیے بس ایک دفعہ ہمارے پچھلے گناہ معاف کیجیے۔ آئندہ جیتے جی ایسی غلطی کبھی نہیں کریں گے، سرکارِ عالی مدار تو ہم سے خواہ مخواہ بدظن ہوئے جاتے ہیں"۔ یہ کلمات مختلف انداز میں مختلف زبانوں سے اس قدر کثرت سے دہرائے گئے ہیں کہ انسان اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ تھیاکریسی کی ماہیت معلوم کرے۔

تاریخِ انسانی کا اگر غیر جانبداری سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانیت کے بعض "بدنام مصلحین" کی طرح یہ لفظ بھی انتہائی مظلوم ہے۔ اسے بھی بعض عیار لوگوں کی ذہنیت کی اسی طرح شکایت ہے جس طرح کہ خدا کے پاک بندوں کو خدا کے باغیوں کی۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے آئینہ دار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں کہ یہ لفظ ہمیشہ ہی ظلم و استبداد کے ہم معنی نہیں رہا بلکہ کبھی اس سے ایک ایسی حکومت کا تصور لیا جاتا تھا جس کے دامن میں شہنشاہیت سے تنگ آئے ہوئے لوگوں نے امن و امان پائی، جس نے انسان پر سے انسان کی خدائی کو ختم کیا، جس نے نوعِ انسانی کے پامال طبقوں کو سہارا دیا، جس نے بنی نوع انسان کو معاشرت کے ایسے پاکیزہ اصول دیئے کہ اُن کی زندگی ہر قسم کی کشاکش اور بے انصافی سے پاک ہو گئی الغرض انسان کو یہ موقع بہم پہنچایا کہ وہ انسانیت کا تاج سر پر رکھ کر پورے سکون کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ اس کے نظم کو چلانے والے بھی سارے بددیانت اور بے علم نہ تھے بلکہ وہ لوگ تھے جنہوں نے عقل و علم کو چار چاند لگائے، جنہوں نے تہذیب کے گیسو سنوارے اور تمدن کو آخری زینے تک پہنچایا۔ پھر یہ لوگ ہمیشہ عوام پر ظلم ہی نہ کرتے رہے بلکہ بسا اوقات انہی کی مساعی سے جبر و استبداد سرنگوں ہوا، غلامی کی زنجیریں کٹیں۔ اور انسان کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ تمام جھوٹے خداؤں کے بندھن توڑ کر صرف خدائے واحد کی بندگی اختیار کرے۔ یہ لوگ بے کار اور ناکارہ ہی نہ تھے بلکہ صحیح معنوں میں پہاڑی کا چراغ اور زمین کا نمک تھے، یہ لوگوں میں سب سے زیادہ دل کے سچے، علم کے گہرے اور تکلفات سے دور تھے۔ اسی وجہ سے انسانی آبادیوں نے ان کی قیادت پر صرف اعتماد ہی نہ کیا بلکہ ان کا والہانہ استقبال بھی کیا۔ یہ لوگ کوئی خوف و دہشت کی طاقت نہ تھے کہ جس کا نقشہ آج پیش کیا جاتا ہے بلکہ نیکی اور عدالت کا پیغام تھے جس کی طرف لوگ دیوانہ وار بڑھے۔ مغلوب قوموں نے خود انہیں بلاوے بھیجے، قلعوں نے اُن کی امانت پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی کنجیاں خود اُن کے قدموں میں ڈال دیں، دکھوں سے چور انسانیت نے انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھا۔ خدا کے یہی وہ پاکباز بندے تھے جنہوں نے اولادِ آدم کی محبت کے لیے جمشید اور قیصر و کسریٰ کے شاہانہ اختیارات کو چیلنج کیا، خسروانہ جلال اور غیر مسئول اقتدار کے سامنے بھی حق بات کہنے سے گریز نہ کیا۔ کبھی اپنی قوم کے ظالم مگر برسرِ اقتدار طبقوں کے خلاف صف آرا ہوئے اور کبھی باہر کے خاقان و فغفور سے جنگ لڑی۔ انہیں کا وجود ہزار ہا سال تک ابتری اور ہلاکت کے راستے میں ایک بڑی روک کا کام دیتا رہا ہے اور انسانیت کو ان تمام فتنوں اور خطرات سے جو عالم پر محیط تھے عرصہ تک کے لیے محفوظ کر دیا۔ اولادِ آدم ان کے احسانات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے کبھی بھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ مشہور مصنف رابرٹ بریفالٹ (ROBERT BRIFFALT.) اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "تعمیرِ انسانیت" (THE MAKING OF HUMANITY) میں بڑے ہی واشگاف الفاظ میں ان لوگوں کی خدمات کا اعتراف کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ مغرب میں خواہ اس تھیاکریسی کا کچھ ہی تصور ہو مگر مشرق میں یہ حکومت ہمیشہ انسانی فلاح کی ضامن رہی چنانچہ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے:۔

> "مشرق میں تھیاکریسی کبھی بھی ذہنی استبداد کا موجب نہیں بنی، ہم یہاں ظلمت پسندی خیالات پر قدغن، اور علم پر پابندی کی کوئی ایسی مثال نہیں پاتے جس کے لیے کہ مغربی دنیا یونان اور روم سمیت مشہور رہے۔[1]

مگر داد دیجئے مغربی دقتِ نظر کی کہ انہوں نے "مذہبی حکومت" کا نقشہ کھینچتے وقت اُن ادوار کا انتخاب کیا ہے جب یہ حکومتیں انحطاط کی لپیٹ میں آ چکی تھیں۔ مذہب جو ان حکومتوں کی اصل بنیاد تھی وہ کوئی انقلاب انگیز قوت نہ رہا تھا بلکہ چند بے جان اور بے روح رسوم کا مجموعہ بن چکا تھا۔ ان کے چلانے والے بھی اُس "پیغام" کو بھول گئے تھے جس کی تڑپ نے انہیں اپنے آپ کو ایک مخصوص اجتماعی قالب میں ڈھالنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے آسان پسندی اور سہل انگاری کے طریقوں کو اختیار کرتے ہوئے سوچنا اور دریافت کرنا چھوڑ دیا، اور اکتسابِ علم اور اجتہادِ فکر کی راہ میں تھک کر بیٹھ گئے۔ پھر وہ دین جس کی وجہ سے انہیں یہ عزت حاصل ہوئی تھی اُس کی محبت دلوں سے غائب ہو گئی اور اس کی جگہ دنیا پرستی نے لے لی۔ اب اگر مفکرین کا کوئی گروہ مذہبی حکومت کے روشن اور تابناک ادوار کو قصداً چھوڑ کر صرف اس کے دورِ انحطاط کو نظر میں رکھ کر اس کی تصویر بناتا ہے تو اسے علمی خیانت کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس پر مزید ستم یہ کہ ان حضرات نے بغیر کسی ادنیٰ تحقیق کے اسلامی حکومت کو بھی اس "تھیاکریسی" کے زمرہ میں شامل کر دیا ہے حالانکہ جس شخص نے تاریخ کا ایک سرسری سا مطالعہ بھی کیا ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ پوری تاریخ اسلامی میں ہمیں کوئی دور ایسا نظر نہیں آتا

[1] ROBERT BRIFFAULT: THE MAKING OF HUMANITY. P. 113.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جبکہ ملت اسلامیہ نے اپنا اجتماعی ڈھانچہ تھیا کریسی کے فرضی نمونہ پر تیار کیا ہو۔ یہ بات ایک دعویٰ کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مسلمان اپنی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں زوال کی آخری سرحدوں کو چھونے کے بعد بھی اُن ساری بے اعتدالیوں سے پاک رہے جن کو کہ عام طور پر مذہبی حکومت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن عقلی اور اخلاقی عناصر سے اس قوم کی تعمیر ہوئی ہے وہ اتنی عمدہ، ٹھوس اور پائیدار ہیں کہ انہوں نے کسی ایسی برائی کو جو ان کے مزاج کو بدل دے اپنے اندر گھسنے نہیں دیا، اور جب کبھی اس قسم کی کوشش کی گئی تو وہ سخت ناکام ثابت ہوئی۔

پیشتر اس کے کہ ہم اسلامی حکومت اور تھیا کریسی کے درمیان جو عظیم فرق پایا جاتا ہے اُس کی وضاحت کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم "مذہبی حکومت" کے متعلق وہ روایات جو عام طور پر مشہور ہیں اُن کا بھی ایک مختصر سا جائزہ لے لیں اس سے آئندہ آنے والے مبحث کو سمجھنے میں کافی حد تک آسانی رہے گی۔

تھیا کریسی کی اصطلاح عام طور پر ایک ایسی ریاست کے لیے بولی جاتی ہے جو مذہب کی بنیاد پر قائم ہو، جس میں سارا اختیار ایک ایسے فرد یا گروہ کے ہاتھ میں ہو جو یا تو اپنے آپ کو مظہر خدا سمجھے یا اُس سے براہِ راست راہنمائی حاصل کرنے کا دعویٰ رکھتا ہو۔ یہ اصطلاح سب سے پہلے قدیم یہودی مورخ جوزیفس نے وضع کی اور اس سے مقصود وہ انداز حکومت تھا جو بنی اسرائیل کی زندگی میں رائج تھا۔ ان حکومتوں میں سیاسی اقتدار یا تو براہِ راست ایک مخصوص مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں ہوتا یا یہ گروہ اقتدار کے تخت پر متمکن ہونے والوں کی حفاظت اور پاسبانی کے فرائض سرانجام دیتا۔ خدا کے احکام حاصل کرنے کا طریقہ اُن کے ہاں یہ تھا کہ وہ سب مل کر اپنے میں سے ایک انسان کا انتخاب کر لیتے اور پھر اُسے یہ حق تفویض کر دیتے کہ وہ اکیلا اُن کی طرف سے خداوند تعالیٰ سے ہمکلام ہو کر اُس کا منشا معلوم کر کے انہیں اس سے آگاہ کرے۔ ان احکام کی بجا آوری بجز اس طبقہ کے سب پر لازم تھی آغاز میں تو سارا اختیار اسی گروہ کے قبضہ میں رہا مگر وقت کے گزرنے کے ساتھ بادشاہ بھی اپنے آپ کو خداوند تعالیٰ کی اس "نوازش" کا حقدار سمجھنے لگا۔ اور اسی طرح اس طبقہ میں یہ ہمت نہ رہی کہ وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حکمراں کے کسی قول یا فعل پر کسی قسم کی لب کشائی کرنے کی جرأت کرے البتہ اُس کے مرنے کے بعد ایک مجلس منعقد کی جاتی اور اُس میں اُس کے اعمال کو جانچ کر یہ فیصلہ کیا جاتا کہ آیا مرنے والا بادشاہ جنت کا مستحق ہے یا دوزخ کا۔ ان لوگوں کا یہ فیصلہ اس کے جانشین کے لیے نہایت اہم ہوتا۔

اگر ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں بھی حکومت کا یہی تصور موجود تھا۔ آغاز میں برہمن کے مقابلہ میں بادشاہ کی حیثیت نہایت ہی ادنیٰ اور کمزور تھی مگر جس رفتار سے اُس کی سلطنت کی حدود پھیلیں، اور اُس کے اقتدار میں اضافہ ہوا اُسی نسبت سے اُس کے اندر الوہیت پیدا ہوتی گئی۔ اور برہمنوں کی یہ ہمت نہ رہی کہ وہ اس کے متعلق کوئی نازیبا کلمہ زبان پر لائیں۔ منو کی جو تعلیمات اسوقت بھی ملتی ہیں اُن سے یہی بات واضح ہوتی ہے۔ بادشاہ کا جسم اُن کے اقوال کے مطابق بالکل پاک اور مقدس ہے۔ کیونکہ وہ ایسے عناصر سے عبارت ہے جن کو جنت میں تیار کیا گیا ہے۔ جس طرح سورج کی روشنی کے سامنے کوئی فرد بھی اپنی آنکھیں کھولنے کی جرأت نہیں کرتا اسی طرح کسی فرد کو بھی بادشاہ کی طرف نگاہ اُٹھانے کی گستاخی نہیں کرنا چاہیے۔ کسی انسان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ اسے بچپن میں بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھے یا اُس کے متعلق یہ گمان کرے کہ وہ محض "بشر" ہے۔ اس تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ کبریائی کے جس مقام پر پہلے برہمن فائز تھا اُس پر اب بادشاہ فائز ہوگیا اور عوام کی جبینِ نیاز اسی "رب" کے سامنے جھکنے لگی۔ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ اس کے کسی فعل پر نکتہ چینی کرے کیونکہ وہ خود اس زمین پر خدا کا مظہر تھا۔ دورِ جدید میں اس طرزِ حکومت کی مثالیں تبت اور جاپان میں ملتی ہیں۔

مذہبی حکومت کے ان سارے تصورات میں سے غالباً سب سے زیادہ عجیب و غریب تصور وہ ہے جو ہمیں یہودیوں سے ملتا ہے۔ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ یہوداہ خود کسی ابر آلودہ رات میں بجلی کی چمک کے ساتھ انہیں اپنے احکام سے نوازتا۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں خدا کی منشا اور مرضی کو معلوم کرنے کا ایک اور طریقہ بھی موجود تھا۔ اُن کا کاہنِ اعظم خیمۂ عبادت میں قدس الاقداس کے اندر جاتا جہاں تابوت ایک پردہ کے پیچھے رکھا ہوتا۔ یہ مقام الہام ربانی کا مرکز خیال کیا جاتا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس پر یہوداہ کے احکام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الہام ہوتے۔ وہ ان احکام سے لوگوں کو روشناس کرتا اور لوگوں پر ان کی اطاعت فرض ہوتی۔ بلنچلی (BLUNTSCHLI) اپنی کتاب نظریۂ ریاست (THE THEORY OF STATE) میں نہایت ہی خوبی سے ان احکام کو حاصل کرنے کے طریقہ کا نقشہ کھینچتا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

"قانون الٰہی ایک سونا منڈھے ہوئے صندوق میں رکھا رہتا جس کی دو کروبی حفاظت کرتے اور جس کی تعظیم الہام ربانی کے مرکزی کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔ تابوت خیمہ کے اندر ایک پردہ کے پیچھے قدس الاقداس میں رہتا تھا اور کاہنوں کی طرف سے پورے اہتمام سے اس کی نگرانی ہوتی تھی۔ یہیں کاہن اعظم یہوہ کے احکام معلوم کرتا اور لوگوں کو مطلع کرتا"۔

"قضاۃ جو قبائل میں شریعت کی تنفیذ پر مامور تھے وہ یہ کام خدا کے نام پر سرانجام دیتے تھے کیونکہ قانون سازی کا حق صرف اللہ کے لیے مخصوص تھا اگر کوئی معاملہ ان کے سامنے ایسا آجاتا جس کا فیصلہ ان کے لیے مشکل ہوتا تو اس میں ان کے لیے ضروری ہوتا کہ لاویوں کے ذریعہ خدا کی مرضی معلوم کریں[1]"۔

قریب قریب یہی حال نصاریٰ کا بھی تھا۔ یورپ کا پاپائی نظام سینٹ پال کا پیرو تھا جس نے موسوی شریعت کو لعنت قرار دے کر مسیحیت کی بنیاد صرف اُن اخلاقی تعلیمات پر رکھی تھی جو نئے عہدنامہ میں پائی جاتی ہیں۔ ان اخلاقی تعلیمات میں کوئی ایسا قانون موجود نہیں ہے جس پر ایک تمدن اور ایک ریاست کا نظام چلایا جاسکے۔ اس لیے جب انہیں ایک نظامِ حکومت قائم کرنا پڑا تو اُن کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشاتِ نفس کے مطابق قوانین وضع کر کے نافذ کرتے اور پھر کہتے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔

تھیاکریسی کے ان مختلف مظاہر کو سامنے رکھ کر اگر ان کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں باوجود ہزار اختلافات کے جو چیز قدرِ مشترک کی سی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں عنانِ اقتدار ان افراد کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو عام انسانوں سے بلند اور بالا ہونے کے ساتھ ساتھ حاکمیت کے

---

[1] BLUNTSCHLI: THE .... OF STATE PP. 350-351.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حقوق بھی رکھتے ہیں۔ یہ لوگ صرف فوق البشر ہونے کے دعویدار ہی نہیں ہوتے بلکہ اپنے آپ کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز بھی سمجھتے ہیں۔ اس لحاظ سے اُن کی حیثیت ایک مطلق العنان کی سی ہوتی ہے جس پر مخلوق کسی قسم کی کوئی تنقید نہیں کر سکتی۔

دنیا کی بدقسمتی کہ مذہبی حکومت سے متعلق ان سارے غلط تصورات کو تھیاکریسی کا نام دے کر اسلامی حکومت کو بھی انہی معنوں میں ایک مذہبی حکومت سمجھ لیا گیا ہے۔ غیر تو غیر خود مسلمانوں کا ایک اچھا خاصا طبقہ بھی اس سے یہی مراد لیتا ہے۔

جب ہم اس عظیم غلط فہمی کے اسباب و علل کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں اس کے تین اسباب نظر آتے ہیں۔

- اسلام کو اُن معنوں میں ایک مذہب سمجھ لیا گیا ہے جن میں یہ لفظ عموماً بولا جاتا ہے۔
- اسلامی ریاست اور یہودی اور عیسائی ریاستوں کے اساسی تصورات میں جو اختلاف ہے انہیں نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔
- عقیدہ ختمِ نبوت کے سیاسی اور تمدنی پہلوؤں پر غور نہیں کیا جاتا۔

مذہب کے معنی عام اصطلاح کے اعتبار سے بجز اس کے اور کیا ہیں کہ وہ چند عقائد اور عبادات اور مراسم کا ایک مجموعہ ہے۔ اس لحاظ سے مذہب کو واقعی خدا اور انسان کے درمیان ایک پرائیویٹ رشتہ ہونا چاہیے۔ مگر اسلام کا معاملہ اس سے بالکل جدا ہے۔ اُس کا اپنا ایک الگ اور مخصوص نظریۂ حیات ہے جو زندگی کے سارے شعبوں پر پوری طرح حاوی ہے۔ اس لحاظ سے مسلمان زندگی کے ہر گوشے میں خواہ اُس کا تعلق اُن کی سیاسی زندگی سے ہو یا اُن کی روحانی زندگی سے مستقل اقدار کے حامل ہیں، وہ ایک متعین اسلوب حیات اور انداز زیست کے مالک ہیں۔ اُن کا مسلمان ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ زندگی کے سارے خانوں میں صرف اسلام کا رنگ بھریں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے سارے معاملات تہذیب و معاشرت، اخلاق و اجتماع، آئین و سیاست علم و فلسفہ کے لیے نہایت واضح احکام صادر فرما دیئے ہیں۔ ان احکام کی موجودگی میں مسلم قوم کو کسی قدس الاقداس یا کاہن اعظم کی ضرورت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں رہتی جو انہیں خدا سے ہمکلام ہو کر اس کے منشا سے واقف کرے۔ عقیدۂ ختم نبوت نے فساد کے ان سارے راستوں کو اچھی طرح مسدود کر دیا ہے۔

یہود اور نصاریٰ کو جس چیز نے تھیا کریسی کے اس دام میں پھنسا دیا وہ یہ تھی کہ اُن کے مذاہب کی تعلیمات صرف اخلاق تک ہی محدود ہیں ان کی مدد سے نہ تو زندگی کا کوئی پورا نقشہ اور نہ ہی اس کا کوئی مکمل ڈھانچہ تیار کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ان مذاہب کے پیروؤں نے جب اجتماعی زندگی کی تعمیر کرنا چاہی تو لامحالہ انہیں راہنمائی کے لیے مذہبی طبقوں پر ہی اعتماد کرنا پڑا۔ ان لوگوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر اپنے ذاتی نظریات کو الہام کی حیثیت سے پیش کر دیا۔

ان قوموں کی گمراہی کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے پاس ان مذاہب کے بانیوں کی زندگی کے ایسے مکمل حالات موجود نہ تھے جن سے زندگی کے سارے معاملات میں رشد و ہدایت حاصل کی جا سکتی۔ ان مقدس لوگوں کی سیرت کو ان کے اپنے ماننے والوں نے اس بری طرح سے مسخ کیا کہ سوائے چند معجزات اور خرق عادت واقعات کے اور کوئی چیز باقی نہ رہی۔ ظاہر بات ہے کہ سیرتوں کے یہ ادھورے اور نامربوط اجزا کسی کامل زندگی کی تقلید اور پیروی کا سامان فراہم نہ کر سکتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ مفسدوں کو شر اور فساد پھیلانے کے لیے ایک نہایت ہی سازگار ماحول میسر آیا۔ مگر اسلام کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں سرورِ کونین کی حیاتِ طیبہ کی جس جذب و شوق کے ساتھ حفاظت کی گئی ہے وہ اب بھی عالم کے لیے مایۂ حیرت ہے۔ اسلام کے شیدائیوں نے جس محنت اور عرق ریزی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال، اور متعلقات زندگی کو محفوظ کیا ہے۔ اُس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ مسلمان تو مسلمان بلکہ نہایت متعصب قسم کے غیر مسلم بھی اس حقیقت کو ماننے پر مجبور ہیں چنانچہ جان ڈیون پورٹ (JHON DEVON PORT) اپنی کتاب اپالوجی فار محمدؐ اینڈ دی قرآن (APOLOGY FOR MUHAMMAD AND THE QURAN) کا آغاز ان الفاظ سے کرتا ہے:۔

"اس میں کچھ شبہ نہیں کہ تمام مقنن اور فاتحین میں ایک بھی ایسا نہیں ہے کہ جس کے وقائع عمری، محمدؐ کے وقائع عمری سے زیادہ مفصل اور سچے ہوں۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ریورنڈ باسورتھ اسمتھ (BASWORTH SMITH) فیلو آف ٹرینیٹی کالج آکسفورڈ نے ۱۸۷۴ء میں "محمد اینڈ محمڈنزم" کے نام سے جو لیکچر دیئے ہیں اُن میں اس حقیقت کا یوں اعتراف کیا گیا ہے:

"جو کچھ عام طور سے مذہب کی ابتدا نامعلوم ہونے کی نسبت صحیح ہے ان تین مذہبوں اور ان کے بانیوں کی نسبت بھی صحیح ہے جن کو ہم کسی بہتر نام موجود نہ ہونے کے سبب سے "تاریخی" کہتے ہیں۔ ہم مذہب کے اولین اور ابتدائی کارکنوں کی نسبت بہت کم اور ان کی نسبت جنہوں نے ان کی محنتوں میں بعد کو اپنی محنتیں ملائیں، شاید زیادہ جانتے ہیں، ہم زرتشت اور کنفیوشس کے متعلق اس سے بہت کم جانتے ہیں، جو سولن اور سقراط کے متعلق جانتے ہیں۔ موسیٰ اور بدھ کے متعلق اس سے کم واقف ہیں جو ہم امبروس (AMBROSE) اور سیزر کے بارے میں جانتے ہیں۔ ہم درحقیقت مسیح کی زندگی کے ٹکڑوں میں سے صرف ایک ٹکڑے سے واقف ہیں۔ ان تیس برسوں کی حقیقت سے کون پردہ اٹھا سکتا ہے، جس نے تین سال کے لیے راستہ تیار کیا۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں اس نے دنیا کی ایک تہائی کو زندہ کیا ہے، اور شاید اور بہت زیادہ کرے، ایک مثالی زندگی جو بہت دور بھی ہے اور قریب بھی ممکن بھی ہے اور ناممکن بھی، لیکن کتنا حصہ ہے جو ہم جانتے ہی نہیں۔ ہم مسیح کی ماں، اُن کی خانگی زندگی، ان کے ابتدائی احباب، ان کے ساتھ ان کے تعلقات، ان کے روحانی مشن کا تدریجی طلوع، یا یک بیک ظہور کی نسبت ہمیں کیا معلومات حاصل ہیں؟ ان کی نسبت کتنے سوالات ہم میں سے ہر ایک کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جو ہمیشہ سوالات ہی رہیں گے، لیکن اسلام میں ہر چیز ممتاز ہے وہ یہ کہ یہاں دھندلاپن اور راز نہیں ہے۔ ہم تاریخ رکھتے ہیں، ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس قدر جانتے ہیں، جس قدر لوتھر اور ملٹن کے متعلق جانتے ہیں۔ میتھالوجی، فرضی افسانے اور مافوق الفطرت واقعات ابتدائی عرب مصنفین میں نہیں ہیں یا اگر ہیں تو وہ آسانی سے تاریخی واقعات سے الگ کیے جا سکتے ہیں، کوئی شخص یہاں نہ خود کو دھوکا دے سکتا ہے اور نہ دوسرے کو دے سکتا ہے۔ یہاں پورے دن کی روشنی ہے، جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے، اور ہر ایک تک وہ پہنچتی ہے۔"[1]

[1] بحوالہ خطبات مدراس۔ از مولانا سید سلیمان [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خدا کی نازل کردہ کتاب اور نبی آخر الزمان کی مقدس زندگی جو دراصل اسی کلام کی تعلیم کا ہی ایک عملی مجسمہ اور پیکر ہے، کے دائرے اتنے وسیع اور محیط ہیں کہ زندگی کے کسی گوشے میں بھی کسی فتنہ پرواز کے لیے فتنہ کھڑا کرنے کی گنجائش نہیں چھوڑتے۔ اسلام نے اپنے نبی (فدا ہوں میرے ماں باپ اُن پر) کی تعلیم اور عمل، لفظاً اور اس کے مصداق دونوں کو اس خوبی سے محفوظ کیا ہے کہ اب کوئی عیار بھی اس ذریعہ سے لوگوں کو فریب نہیں دے سکتا۔ ہادی برحق نے اس دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے یہی فرمایا تھا۔

ترکت فیکم الثقلین کتاب اللہ و سنتی ۔ میں تم میں دو مرکزِ ثقل چھوڑ رہا ہوں خدا کی کتاب اور اپنا عملی راستہ۔

چنانچہ مسلمانوں کی تاریخ کا ہر ورق اس حقیقت کا شاہد ہے کہ مسلمانوں نے بعد کے ادوار میں اگرچہ اسلامی تعلیمات سے کسی حد تک بے تعلقی کا مظاہرہ کیا مگر انہوں نے کبھی بھی دین کے ان دو قلعوں میں رخنے پیدا کرنے کی جرأت نہ کی۔ وہ باوجود اپنی بے عملی کے اسی قرآن اور سنت کو اپنا آخری راہنما اور ثالث تسلیم کرتے رہے اور اس بات کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے کہ اسی کی روشنی میں اپنا زندگی کا سفر طے کریں۔ انہیں کبھی بھی اس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ وہ اپنے میں سے کسی کو طور کی چوٹی پر بھیج کر خدا کی منشا اور رضا کو معلوم کریں۔ اُن کے دلوں میں یہ خیال ہمیشہ راسخ رہا کہ وہ اسی قرآن اور سنت کی بدولت اپنی ہستی سے شعلۂ سینائی پیدا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اس لیے مسلم قوم بحیثیت مجموعی تھیاکریسی کے سارے فتنوں سے محفوظ رہی اور جب کبھی کسی کوتاہ اندیش نے اس کا عزم بھی کیا تو دین کے خدائیوں نے اس کے ناپاک ارادوں کو بالکل ناکام بنا دیا۔

یہی نہیں بلکہ اسلام نے انسانوں سے حاکمیت کے حقوق کو بالکل سلب کر کے حیاتِ انسانی میں شر کے اصل سرچشمہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے، وہ چیز جو انسان کے سارے مصائب، اس کی ساری تباہ کاریوں، اس کی تمام محرومیوں کی اصل جڑ ہے وہ یہ ہے کہ انسان اقتدار کے نشہ میں خود انسان کا خدا بن جاتا ہے۔ ان مذہبی ریاستوں میں بھی فتنے کا آغاز اسی سے ہوا کہ ایک طبقہ نے صرف اپنے آپ کو ہی خدا کی کتاب کا اصل حامل قرار دیتے ہوئے دوسروں کو اس کے علم سے بالکل محروم کر دیا اور خود اپنے زعم میں خدا کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زبان بن کر حلال و حرام کے احکام صادر کرنے لگا، اس طرح اُن کی ذاتی آرا کو الہام کی سی حیثیت حاصل ہو گئی اور وہ انسانوں کو خدا کی بجائے خود اپنے احکام کا تابع بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

قرآن حکیم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کفار اور مشرکین اور انبیاء علیہم السلام کی لڑائی کا محور صرف یہی باطل عقیدہ تھا۔ کفار اللہ کو اپنا رب۔ اس کائنات کا خالق اور اس کا مالک تو تسلیم کرتے تھے مگر وہ اسے اس کا تنہا فرماں روا اور قانون ساز نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس بحث کے بیشمار نمونے ملتے ہیں۔ یہاں صرف چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۔ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۔ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۔ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۔ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۔ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۔ (المؤمنون ۵)

ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے وہ کس کا ہے، بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے اللہ کا ہے، کہو پھر تم غور نہیں کرتے۔ ان سے پوچھو، ساتوں آسمانوں کا رب اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ کہیں گے اللہ۔ تو پھر تم اس سے ڈرتے نہیں؟ ان سے پوچھو وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے مگر کوئی اس کے مقابلے میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اللہ۔ کہو پھر تم کس دھوکے میں ڈال دیئے گئے ہو۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۔

اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور کس نے سورج اور چاند کو تابع فرمان بنا رکھا ہے وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر یہ آخر کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں؟ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی اتارا اور کس نے مری ہوئی زمین کو روئیدگی بخشی؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سوال یہ ہے کہ اگر اس جھگڑے کی بنیاد خدا کا انکار نہیں تھی تو اور کیا تھی۔ قرآن کہتا ہے یہ ساری نزاع اس بات پر تھی کہ خدا کے مرسلین کہتے تھے کہ جس خدا کو تم اس زمین و آسمان کا خالق مانتے ہو اُسے اپنا الٰہ، حاکمیت کا واحد مالک اور قانون ساز بھی سمجھو۔ اُس کی اس بادشاہت میں کسی فرد یا گروہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنا قانون جاری کرے۔ اگر کوئی شخص یا طبقہ ایسا کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی خدائی میں ساجھا بٹانے کی جرأت کا مرتکب ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم انہی وجوہ کی بنا پر یہود و نصاریٰ دونوں کو اس امر کا مجرم قرار دیتا ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا
اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔

انہوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو اللہ کے سوا رب ٹھیرا لیا ہے اور مسیح ابن مریم کو حالانکہ ان کو نہیں حکم دیا گیا ہے مگر اس بات کا کہ ایک ہی خدا کی بندگی کریں۔ جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ خدا کا شریک ٹھیراتے ہیں۔

اس آیت کی تشریح خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریق سے بیان فرمائی ہے وہ صورت حال کو سمجھنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ عدی بن حاتم نے سرورِ عالم سے یہ پوچھا کہ یہود و نصاریٰ اپنے عالموں اور راہبوں کو رب تو نہیں کہتے؟ آپ نے فرمایا کہ کیا یہ بات نہیں ہے کہ اللہ نے جو چیزیں حلال قرار دی ہیں ان کو وہ حرام کرتے ہیں تو تم ان کو حرام قرار دیتے ہو اور جن چیزوں کو اللہ نے حرام کیا ہے ان کو وہ حلال کر دیتے ہیں۔ تو تم ان کو حلال قرار دے دیتے ہو۔ عدی بن حاتم نے کہا۔ ہاں یہ بات تو ہے حضور نے فرمایا: فَتِلْكَ عِبَادَتُهُمْ یہی ان کی عبادت ہے۔ اسلام نے جس طریق سے حاکمیت پر سے افراد یا طبقوں کے تسلط کو ختم کیا ہے اُس سے اس قسم کے سارے فتنے خود بخود مٹ گئے ہیں۔ اور اب اسلامی حدود میں ان کو سر اٹھانے کی کبھی بھی جرأت نہیں ہو سکتی۔ یہاں فرد تو کیا پوری انسانیت کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی طرف سے کہی ہوئی کسی بات کو خدا کی طرف منسوب کرے یا اُسے اس حیثیت سے پیش کرے کہ وہ فرمانِ الٰہی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے جس بلیغانہ انداز میں اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے اُس سے اس مسئلہ کی اہمیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ۔ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ۔

حکم سوائے اللہ کے کسی اور کا نہیں۔ اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے۔

یَقُوْلُوْنَ ھَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ، اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ۔

وہ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہو کہ اختیارات تو سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُکُمُ الْکَذِبَ ھٰذَا حَلٰلٌ وَّھٰذَا حَرَامٌ

اپنی زبانوں سے یونہی غلط سلط نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اعراف)

خبردار خلق اور امر اللہ کے لیے ہی ہے۔

ان آیات شریفہ سے اس امر کی پوری طرح صراحت ہو جاتی ہے کہ قرآن پاک کی رو سے حکمرانی، فرماں روائی، اور قانون سازی کا اصل حق صرف ذات باری تعالیٰ کو حاصل ہے۔ انسان خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو بہر حال بندہ ہے اور اس لحاظ سے اُسے یہ بات کسی صورت بھی زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنی اصل اور جائز حدود سے تجاوز کر کے مقام کبریائی پر فائز ہونے کا دعویٰ کرے۔ حاکمیت خواہ سلاطین و ملوک کی ہو، امراء و حکما کی ہو، خاندانوں اور نسلوں کی ہو، علماء و احبار و رہبان کی ہو، جمہوریت و وطنیت کی ہو، خواہ خود اُس کے اپنے نفس کی ہی کیوں نہ ہوں یہ سراسر باطل ہے، اس کلیہ میں کوئی استثناء نہیں، اس اصول میں کوئی لچک نہیں۔ حاکمیت کا حق عام انسانوں کو تو کیا انبیاء تک کو بھی نہیں دیا گیا حتیٰ کہ خداوند تعالیٰ کے سب سے برگزیدہ نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پاک سے بھی یہ الفاظ کہلوائے گئے۔

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَہُ اللّٰہُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ:۔

کسی بشر کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اسے کتاب اور حکم اور نبوت سے سرفراز کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کی بجائے میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ تم ربانی بنو۔

وَلَا یَاْمُرَکُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِکَۃَ وَالنَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا

(خدا) یہ حکم نہیں دیتا کہ فرشتوں اور نبیوں کو خدا بناؤ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلامی حکومت اور تھیاکریسی کے اگر اس بنیادی فرق کو ذہن نشین کر لیا جائے تو باقی امور بڑی ہی آسانی سے حل ہو سکتے ہیں۔ اسلام جس حکومت کا تصور پیش کرتا ہے اس میں خداوند تعالیٰ کے اقتدارِ اعلیٰ کے تحت سارے مسلمانوں کو ایک محدود عمومی حاکمیت عطا کی گئی ہے۔ یہ حق کسی ایک گروہ کو تفویض نہیں کیا گیا۔ بلکہ ہر مسلمان اس زمین پر خدا کا نائب، شاہد علی الناس اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں براہ راست خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ یہاں عاملہ صرف ایک فرد یا ایک گروہ کی رائے سے نہیں بلکہ سارے مسلمانوں کی رائے سے بنے گی۔ مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہوں گے۔ سارے انتظامی معاملات اور وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے، مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہوں گے۔ اور الٰہی قانون جہاں تعبیر طلب ہوگا وہاں کوئی مخصوص طبقہ یا نسل نہیں بلکہ پوری ملتِ اسلامیہ میں سے ہر شخص خواہ اس کی دنیاوی حیثیت کچھ ہی ہو اس بات کا مستحق ہوگا کہ وہ اس میں اپنی رائے پیش کر سکے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کی کئی مقامات پر صراحت فرمائی ہے۔ ہم یہاں حضرت علیؓ سے ایک روایت نقل کرتے ہیں:-

قلت یا رسول اللہ الامر ینزل بنا بعدك لم ینزل فیه قرآن ولم یسمع منك فیه شئ، قال اجمعوا العابدین من امتی و اجعلوه بینکم شوریٰ ولا تقضوا برای واحد (روح المعانی)

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کے بعد کوئی معاملہ ایسا پیش آجائے جس کے متعلق نہ قرآن میں کچھ اترا ہو اور نہ آپ سے کوئی بات سنی گئی ہو؟ فرمایا میری امت میں سے عبادت گزار لوگوں کو جمع کرو اور اسے آپس کے مشورے کے لیے رکھ دو اور کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔

اس ضمن میں ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ازالہ کر دینا بھی ضروری ہے۔ بعض لوگوں نے اس حکم سے کہ اسلامی ریاست میں سب مسلمان برابر ہیں اور تعبیر کا حق کسی خاص قوم، طبقہ یا گروہ کے لیے مخصوص نہیں، یہ نتیجہ اخذ کر لیا ہے کہ ہر کس و ناکس تعبیرِ احکام اور اجتہاد و استنباط کرنے کا پوری طرح مجاز ہے۔ اسلام بیشک کسی ایک فرد یا چند افراد کی اجارہ داری نہیں مگر اس حدیث نے اس بات کی بھی وضاحت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کردی ہے کہ کسی اجتہادی مسئلہ میں ہر شخص کی رائے بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ یہ کام اُنہی لوگوں کا ہے جو "عیادت" گذار ہوں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تھیاکریسی کے برعکس اسلام میں کسی پریسیٹ ہڈ کی گنجائش نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دینِ حق میں کتاب و سنت کا علم نہ تو بنی اسرائیل کی طرح نسل اور قبیلے کی میراث ہے، نہ عیسائیوں کی طرح صرف پوپ اور پادریوں تک محدود ہے اور نہ ہی ہندوؤں کی طرح صرف برہمنوں کا آبائی حق ہے بلکہ یہاں ہر شخص اس پر وقت اور محنت صرف کر کے مسائلِ شریعت میں کلام کرنے کا مجاز ہو سکتا ہے۔ اسلام میں پریسیٹ ہڈ اور برہمنیت" نہ ہونے کا اگر کوئی معقول مطلب ہے تو وہ یہی ہے۔ نہ یہ کہ اسلام کو کوئی بازیچۂ اطفال بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے جس سے ہر شخص خواہ اُس کا علم کس قدر ناقص ہو، اس کا فکر کس قدر نارسا ہو، اور اُس کی زندگی تقویٰ سے کس قدر خالی ہو، کھیلتا پھرے۔ یہاں علم کے دروازے ہر اُس شخص پر کھلے ہیں جو اس کو حاصل کرنے کا خواہشمند ہو۔ ؎

جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

اس کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ تھیاکریسی میں برسرِ اقتدار طبقہ عوام الناس سے غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ جس بنیادی تخیل پر اس کی تعمیر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حکمران خدا کا نائب یا اس کا مظہر ہونے کی وجہ سے صرف اُسی کے سامنے ہی جوابدہ ہے۔ اس لیے لوگوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اُس کے کسی قول یا فعل کے متعلق اُس سے کوئی باز پرس کر سکیں۔ اُن کا فرض صرف یہی ہے کہ وہ اقتدار کے مسند پر قابض ہونے والے لوگوں کی بلا چون و چرا اطاعت کرتے رہیں۔ اسلام نے اس کے برعکس اس امر کی بار بار صراحت فرمائی ہے کہ اسلامی ریاست میں اولی الامر اُس وقت تک لوگوں سے اطاعت کا مطالبہ کر سکتا ہے جب تک کہ وہ خود احکامِ خدا اور رسول کا پابند ہو۔ اور اگر وہ ان کی پابندی نہیں کرتا تو وہ اطاعت کا مستحق بھی نہیں ٹھہرتا۔ کیونکہ اُس کی اطاعت صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ اس زمین میں خدا کی منشا کو پورا کرنے کے لیے جو نظام قائم کیا گیا ہے اُس کو چلانے کے لیے وہ سب سے زیادہ اہل ہے۔ اور اگر وہ اس بنیادی مقصد کو پورا نہیں کرتا تو اُس کی امارت بالکل بیکار ہے بلکہ سراسر ظلم اور ناانصافی ہے۔ قرآن اس باب میں صاف صاف کہتا ہے کہ:۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا (الکہف)

اور کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہو اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہو اور جس کا امر حدود آشنا نہ ہو۔

وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (الشعراء)

اور حد سے گزر جانے والوں کے امر کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ اس معاملے کو یوں فرماتے ہیں:۔

اَلسَّمْعُ والطاعةُ علی المرءِ المسلمِ فی ما اَحَبَّ وکَرِہَ مالم یُؤمَرْ بمعصیةٍ فاذا امر بمعصیةٍ فلا سَمْعَ ولا طاعةَ

ایک مرد مسلمان پر سمع وطاعت لازم ہے خواہ برضا و رغبت، خواہ بکراہت، تاوقتیکہ اس کو معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ پھر اگر معصیت کا حکم دیا جائے تو نہ سمع ہے نہ طاعت۔

لا طاعة فی معصیة انما الطاعة فی المعروف

معصیت میں کوئی طاعت نہیں، طاعت صرف معروف میں ہے۔

اس طرح مختلف روایات سے یہ ثابت ہے کہ حضرات خلفا جب بھی لوگوں سے بیعت لیتے تو اس امر کی خود ہی صراحت فرما دیتے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق نے خلافت کا بار سنبھالتے ہوئے جن خیالات کا اظہار فرمایا وہ اسی کی تائید کرتے ہیں۔

ایها الناس قد ولیت علیکم ولست بخیرکم فان احسنت فاعینونی وان اساءت فقومونی، الصدق امانة والکذب خیانة والضعیف فیکم قوی عندی حتی اخذ له حقه والقوی ضعیف عندی حتی اخذ منه الحق - اطیعونی ما اطعت الله و

اے لوگو! میں تمہارا ولی مقرر کیا گیا ہوں۔ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں بھلائی کروں تو مدد کرو۔ اگر میں برائی کروں تو مجھے تنبیہ کرو۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تم میں سے جو ضعیف ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا حق دلوا دوں اور قوی ضعیف ہے یہاں تک کہ اس سے غریب کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رسولہ فاذا عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعۃ لی علیکم۔

حق لوں۔ میری اطاعت کرو اس وقت تک جب تک میں اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا ہوں۔ اگر میں اللہ اور رسول کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں اسی اہم مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"امام اور خلیفہ کا تقرر انہی مصالح کے قیام و استحکام کے لیے ہے جن کی بدولت ملت بیضا اور تمدن کا نظام احسن طریقہ پر قائم رہ سکتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت انہی دو گونہ مصالح کے حصول کے لیے ہے۔ امام المسلمین یا خلیفۃ المسلمین آپ ہی کا نائب اور آپ کے احکام کے اجراء و تنفیذ کا ذریعہ ہے۔ اس لیے اس کی اطاعت بعینہٖ رسول اکرم کی اطاعت ہے اور اس کی نافرمانی کرنا رسولِ خدا کے حکم کو نہ ماننے کے مترادف ہے۔ لیکن اگر وہ کسی ایسی بات کا حکم دے جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی ہوتی ہے تو ان دریں حالات وہ واجب الاطاعت نہیں۔"

اسی سے یہ بات بھی مستنبط ہوتی ہے کہ اسلامی حکومت، مذہبی حکومت کی طرح اربابِ اختیار کو ایسے بلند مقامات عطا نہیں کرتی جو تنقید سے بالاتر ہوں۔ یہاں ہر صاحب امر اگر ایک طرف اپنے اعمال کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے تو دوسری طرف وہ خلافت کے نازک ترین فرائض کی بجا آوری کے لیے خلق کے سامنے بھی ماخوذ ہے۔ اسلام میں حکومت تھیاکریسی اور قسطائیت کی طرح کوئی غیر مسئول ادارہ نہیں کہ برسرِ اقتدار طبقے جو چاہیں کرتے پھریں اور کوئی ان سے باز پرس کرنے کی جرأت نہ کرے۔ یہاں ہر حاکم کے افعال پر احتساب کیا جا سکتا ہے۔ خود خلفاء راشدین کا اپنا عمل یہ ظاہر کرتا ہے کہ خدا کے ان پاک بندوں نے نہ صرف تنقید کو برداشت کیا بلکہ اس کا پوری طرح خیر مقدم بھی کیا۔ کیونکہ انہیں علم تھا کہ عوام کے اندر احتساب کی روح کا مردہ پڑ جانا پوری ملت کے لیے ایک عظیم خطرہ کا باعث ہو سکتا ہے۔ انہوں نے جب کبھی بھی یہ دیکھا کہ لوگ رسولِ خدا کے علاوہ کسی دوسرے انسان کو معیارِ حق بنا رہے ہیں، تو وہ فوراً چوکنے ہو گئے اور اس بیماری کو دور کرنے کی پوری کوشش کی۔ ان کے اس احساس کا اندازہ اس ایک واقعہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں میں کچھ غلط فہمی پھیل گئی کہ آدمی پر صرف اس کے اپنے عمل کی ذمہ داری ہے۔ جماعت کے دوسرے لوگ جو چاہیں کرتے رہیں۔ ان کی برائی اور بھلائی سے متعلق خدا کے ہاں اس سے کوئی پرسش نہیں ہوگی۔ یہ لوگ قرآن پاک کی اس آیت سے دلیل پکڑتے تھے کہ "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ، لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ" (اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو بچاؤ، جو لوگ گمراہ ہیں ان کی گمراہی تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی جب کہ تم خود ہدایت پر ہو) حضرت ابوبکرؓ کو جب لوگوں کی اس غلط فہمی کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اس کو بڑی اہمیت کے ساتھ محسوس کیا اور خیال کیا کہ اگر یہ غلط فہمی عام ہوگئی تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی وہ روح ہی لوگوں کے اندر مردہ ہوجائے گی جس کے بغیر اسلامی معاشرہ اور اسلامی نظام کا اپنی صحیح حالت پر قائم رہنا ناممکن ہے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے لوگوں کے سامنے ایک تقریر میں فرمایا:۔

"اے لوگو! تم اس آیت کا حوالہ دیتے ہو، یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ الآیہ اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ لوگ جب برائی دیکھتے ہیں اور اس کی اصلاح نہیں کرتے تو بہت ممکن ہے کہ اس کے سبب سے جو عذاب آئے وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔" (کتاب الخراج)

"تاریخ عالم کا کونسا ایسا طالب علم ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رعب و دبدبہ کو نہ جانتا ہو لیکن اس کے باوجود انہوں نے لوگوں کی تنقید کو نہایت ہی ٹھنڈے دل اور خندہ پیشانی کے ساتھ سنا بلکہ بعض مواقع پر اس کی حوصلہ افزائی فرمائی۔[2]

---

[1] بحوالہ حقیقت شرک از مولانا امین احسن اصلاحی۔

[2] چند سالوں کا ذکر ہے کہ پنجاب میں ایک صاحب تھے جو فسطائیت سے مرعوب تھے، امیر کے احتساب پر شدید نقطہ چینی کی اور اپنے اس نظریہ کی تائید میں عجیب وغریب دلائل دیئے، اور یہاں تک کہہ گئے کہ وہ مقدس انسان جس نے حضرت عمر فاروقؓ سے چادروں کی تقسیم کے متعلق استفسار کیا تھا اس کے بارے میں "بدبخت" اور "کم بخت" جیسے نازیبا الفاظ کا استعمال کر ڈالا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ واقعات اتنے لاتعداد ہیں کہ ان سب کو ایک مستقل کتاب میں ہی سمیٹا جا سکتا ہے ہم یہاں صرف چند ہی نقل کرتے ہیں :۔

" حضرت حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے کہا، اے عمر! اللہ سے ڈرو اور اس جملہ کو بار بار دہرایا، ایک دوسرے شخص نے اس کو ٹوکا کہ اب بس بھی کرو، بہت ہو چکا حضرت عمرؓ نے فرمایا ان کو کہنے دو۔ اگر یہ ہمیں ایسی باتیں نہ کہیں تو ان میں کوئی خوبی نہیں اور اگر ہم ان کی نصیحتوں کو قبول نہ کریں تو ہم میں کوئی خوبی نہیں" (کتاب الخراج)

ایک دفعہ رعایا کے حقوق و فرائض کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا :۔

" اور تم میرے نفس کے مقابلہ میں میری مدد اس طرح کر سکتے ہو کہ مجھے بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو نیز خدا نے تمہاری جو ذمہ داری مجھ پر ڈالی ہے۔ اس کے بارہ میں میری خیر خواہی یہی ہے کہ مجھے نصیحت کرتے رہو" (کتاب الخراج)

اسی طرح حضرت عمرؒ بن عبد العزیز نے ارشاد فرمایا :۔

" اللہ تعالیٰ خواص کی بد کاریوں کی پاداش میں عوام کو نہیں پکڑتا مگر جب برائیاں کھلم کھلا ہونے لگتی ہیں اور ان کے خلاف آواز نہیں اٹھتی تو سب سزا کے مستحق قرار پاتے ہیں" (کتاب الخراج)

خلفاء راشدین کے اسی خدا پرستانہ طرزِ عمل کا نتیجہ تھا کہ ایک معمولی سے معمولی بدو اور غریب سے غریب بڑھیا بر سرِ عام حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر خلیفہ سے بغیر کسی خوف کے باز پرس کرتے ہیں۔ اُن سے پوچھتے ہیں کہ اے عمرؓ تم نے یہ کیوں کیا۔

اس قبیل کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ اور یہ سب اس بات کی قوی دلیل ہیں کہ اسلامی حکومت میں تھیاکریسی کی طرح اختلاف اقتدار کے سامنے دم بخود نہیں ہوتا، تنقید اس کے روبرو مہر بہ لب نہیں رہتی بلکہ عوام کو اس بات کا پورا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ خلیفہ کے پرائیویٹ سے پرائیویٹ معاملہ پر بھی اگر ضرورت پیش آئے تو بلا تامل اور بے دریغ حرف گیری کریں۔

تھیاکریسی جن نظریات کے سہارے زندہ رہی اُن میں ایک نسلی اور نسبی فضیلتوں کا عقیدہ بھی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہندوستان کے قدیم برہمن اور یہود اور نصاریٰ کے مذہبی پیشوا ایک مدت تک مرجع خلائق بننے اور امن و فارغ البالی کی زندگی میسر آنے کی وجہ سے اس خبط میں مبتلا ہو چکے تھے کہ یہ اُن کا پیدائشی حق ہے۔ وہ خدا کے سب سے زیادہ عزیز اور محبوب بندے ہیں اور اس لیے یہ عزت، یہ سیادت، یہ سربراہی اُن کا لازمی حصہ ہے جو کبھی ان سے منفک نہیں ہو سکتا۔ قرآن حکیم اُن کے ان دعووں کو سراسر باطل قرار دیتا ہے۔

سورۂ مائدہ میں ہے :-

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ۔ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ

اور یہود و نصاریٰ کہتے ہیں ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں۔ پوچھو پھر خدا تمہیں گناہوں کے بدلے میں سزا کیوں دیتا ہے بلکہ تم بھی خدا کی مخلوق کے عام آدمیوں کی طرح ہو وہ بخشے گا جس کو چاہے اور سزا دے گا جس کو چاہے۔

اسلامی حکومت میں شرافت اور بزرگی کا معیار کسی خاص قبیلہ اور گروہ سے تعلق نہیں بلکہ تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔ قرآن حکیم نے اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ کہہ کر صرف انسانی اعمال کو شرف و احترام کا مستحق ٹھہرایا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نسل و نسب کے تفاخر کو جو تھیا کریسی کی جان ہے یہ کہہ کر ختم کر دیا۔

یا معشر قریش ان اللہ قد اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیۃ وتعظمھا بالآباء الناس من آدم وآدم من تراب ـ (ابن ہشام)

اے قریش کے لوگو! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا فخر خدا نے مٹا دیا ہے، تمام انسان آدم کی نسل ہیں اور آدمی مٹی سے بنے ہیں۔

حجۃ الوداع کے مجمع میں پھر اعلان فرمایا :-

لیس للعربی فضل علی العجمی ولا للعجمی فضل علی العربی، کلکم ابناء آدم وآدم من تراب ـ

عرب کو عجم اور عجم کو عرب پر کوئی فضیلت نہیں ہے، تم سب کے سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے[1]

[1] حدیث شریف میں ہے لاتاتونی بالانساب وائتونی بالاعمال کہ میرے سامنے نسب نہ لاؤ، عمل لاؤ) اور دیا قی ص۲۰۰ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک سپہ سالار کو ضروری ہدایت دیتے ہوئے اس اصول کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی۔

لیس بین اللہ و بین احد نسب	اللہ اور کسی شخص کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے مگر
الا بطاعۃ فالناس شریفھم و وضیعھم	اس کی اطاعت کے واسطہ سے اس وجہ سے خدا
فی دین اللہ سواء۔	کے قانون میں شریف اور حقیر سب برابر ہیں۔

عدل و انصاف کے یہ سنہری اصول صرف قول و اقرار تک ہی محدود نہ تھے بلکہ زمانہ اس بات پر گواہ ہے کہ انہیں دنیا میں نافذ بھی کیا گیا۔ ان کے ذریعہ دنیا بھر کی سطوت و خدائی ختم ہوئی اور اس زمین پر صرف ایک خدا کے تخت کو بچھایا گیا۔ پندار و غرور نے الوہیت و خدائی کی جتنی صورتیں اختیار کر رکھی تھیں ان سے انسان کو نجات نصیب ہوئی اور نسل، قوم کے نام پر انسانی خواہشات و آرزوؤں کے جتنے صنم خانے آباد تھے انہیں نیست و نابود کر دیا گیا۔ اگر اس کائنات کے حافظہ میں نسبی برتری اور تفوق کے چند روح فرسا واقعات محفوظ ہیں تو اسی کائنات کے لیل و نہار کی سلوٹوں میں آج ہمیں ایک ایسا روشن دور بھی ملتا ہے جس میں امیر و غریب، حاکم و محکوم کے سارے مصنوعی اختلافات حرف غلط کی طرح مٹا دیئے گئے۔ یہ اسی "دور سعید" کا اعجاز تھا کہ محمود و ایاز "صرف مسجد میں ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر میدان میں ایک ہی صف میں کھڑے کر دیئے گئے۔ کہاں یہ عالم کہ کوئی نیچ ذات کا انسان اونچ ذات کے انسان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہ کرتا اور کہاں یہ انصاف کہ ایک معمولی سے معمولی شخص بھی اپنے وقت کے خلیفہ، اور سب سے زیادہ با اختیار انسان کو عدالت کے

(بقیہ حاشیہ ص۱۹۹) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف یہ شعر منسوب ہے ؎

انا ابن نفسی و کنیتی ادبی	من عجم کنت او من العرب
ان الفتی من یقول ھا انا اذا	لیس الفتی من یقول ابی

میں اپنے نفس کا بیٹا ہوں اور کنیت میرا ادب ہے۔ نسب عجمی ہو یا عربی مردود ہے۔ جوان وہ ہے جو اپنی ذات کو پیش کرے، نہ کہ وہ جو باپ کا نام پیش کرے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کٹہرے میں بلوانے کا مجاز ٹھہرا۔ ایک خلیفہ کا تو ذکر ہی کیا خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے قانون کے معاملہ میں کوئی رعایت طلب نہیں کی۔

ایک مرتبہ قریش کے ایک معزز گھرانے کی ایک عورت نے چوری کی۔ چوری کی سزا اسلام میں ہاتھ کاٹ دینا ہے بعض لوگوں نے اس عورت کی خاندانی عظمت کے پیش نظر اس کے لیے قانون میں کچھ رعایت حاصل کرنا چاہی۔ چنانچہ اسامہؓ بن زید سے، جو آنحضرت کو نہایت ہی محبوب تھے درخواست کی گئی کہ وہ اس عورت کے بارہ میں آپ سے سفارش کریں۔ انہوں نے لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر آنحضرت سے سفارش کی۔ آپ نے اُن کی اس حرکت پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ پھر لوگوں کے سامنے ایک خطبہ دیا اور فرمایا کہ تم سے پہلے بہت سی قومیں اس وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ جب ان میں کوئی معمولی آدمی ارتکاب جرم کرتا تو اسے سزا دیتے تھے مگر جب کوئی بااثر آدمی یہ حرکت کرتا تو اس سے درگذر کرتے۔ اس کے بعد نہایت ہی زور کے ساتھ یہ فرمایا:۔

والذی نفس محمد بیدہ لو سرقت فاطمۃ بنت محمد لقطعت یدھا

اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں محمدؐ کی جان ہے اگر فاطمہؓ بنت محمد نے چوری کی ہوتی تو میں اس کا ہاتھ بھی ضرور کاٹ دیتا۔

اس بے لاگ عدل کی ایک دوسری مثال بھی ملاحظہ ہو:۔

"عمرو بن عاص مصر کے فاتح بھی تھے اور وہاں کے گورنر بھی تھے۔ اُن کے بیٹے محمد کا قصہ ہے کہ اس نے ایک مصری کو کوڑے مارے اور مارتے ہوئے یہ کہا "کہ یہ لے، میں ایک بڑے باپ کا بیٹا ہوں"۔ عمرو بن عاص نے مصری کی داد رسی کرنے کی بجائے الٹے اس کو گرفتار کر لیا کہ کہیں مدینہ جا کر امیر المومنین سے شکایت نہ کر دے۔ مصری کچھ مدت کے بعد جب رہا ہوا تو سیدھے مدینہ پہنچا اور اس ظلم کی شکایت حضرت عمرؓ سے کی۔ حضرت عمرؓ نے مصری کو اپنے پاس روک لیا اور عمرو بن عاص اور ان کے بیٹے کو مصر سے طلب فرمایا۔ دونوں مجلس قصاص میں حاضر کئے گئے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے مصری کو بلایا اور اس کے ہاتھ میں کوڑا دے کر فرمایا "یہ لے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور پہلے اس سے بڑے باپ کے بیٹے کی خبر لے۔" مصری نے محمد کو مارا اور لہولہان کر دیا۔ اور اس دوران میں حضرت عمر برابر فرماتے رہے کہ "ہاں مار اس بڑے باپ کے بیٹے کو۔" جب مصری مار چکا اور کوڑا حضرت عمر کو واپس کرنے لگا تو حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا "کہ ایک آدھ عمرو بن عاص کی چندیا پر رسید کر کیونکہ انہی کے بل پر ان کے برخوردار نے تجھے کوڑے مارنے کی جرأت کی۔ عمرو بن عاص نے عرض کی امیر المومنین! انصاف کا حق ادا ہو گیا۔ مصری نے بھی کہا کہ امیر المومنین میرے ساتھ جس نے زیادتی کی تھی مَیں نے اس سے بدلہ لے لیا۔ اب کسی اور سے بدلہ لینے کا خواہشمند نہیں ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تجھے اختیار ہے ورنہ اگر تو ان کو بھی مارتا تو مَیں ان کے اور تیرے درمیان حائل ہونے والا نہیں تھا۔ یہاں تک کہ تو خود ان کو چھوڑ دیتا۔ اس کے بعد عمرو بن عاص کی طرف نہایت غضبناک انداز میں دیکھ کر بولے "عمرو! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا ہے، حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا[1]"

دنیا کے اس جلیل القدر انسان نے اپنی قوت و جبروت کے باوجود جس احسن طریقہ سے اپنے آپ کو ایک عام مسلمان کی سطح پر زندہ رکھا۔ اُس کی مثال "مذہبی حکومت" میں تو کیا دورِ جدید کی کسی متمدن سے متمدن حکومت میں بھی نہیں ملتی۔ اپنی درماندگی کا اعتراف کرتے ہوئے انہوں نے ایک دفعہ فرمایا:۔

میں ایک عام مسلمان اور کمزور بندہ ہوں۔ صرف اللہ تعالیٰ کی مدد کا مجھے بھروسہ ہے میں جس منصب پر مقرر کیا گیا ہوں۔ انشاء اللہ وہ میری طبیعت میں ذرہ برابر بھی تغیر پیدا نہیں کر سکے گا۔ بزرگی اور بڑائی جتنی کچھ بھی ہے سب اللہ کے لیے ہے، بندوں کے لیے اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ تم میں سے کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملے گا کہ عمر خلیفہ بن کے کچھ سے کچھ ہو گیا ہے۔ میں اپنی ذات سے بھی حق وصول کر لوں گا اور جس معاملہ میں ضرورت ہو گی خود بڑھ کر صفائی پیش کر دوں گا۔ جس شخص کو کوئی ضرورت ہو یا جس پر کوئی ظلم ہوا ہو، یا جو شخص میری کسی بات پر نکتہ چینی کرنا چاہتا ہو، وہ براہِ راست میرے پاس آئے میں تمہارے ہی

[1] بحوالہ حقیقتِ شرک از مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کا ایک آدمی ہوں۔ تمہاری بہبود مجھے عزیز ہے۔ تمہاری خفگی مجھ پر گراں ہے۔"

باطل پرست عربوں کو حضور سرورِ دو عالم کے جس کام کا سب سے زیادہ شکوہ تھا وہ یہی کہ آپ کی تعلیم سے مساوات و اخوت کے اصول مستحکم ہوتے ہیں اور نسلی شرافت و فضیلت کے تصور کو صدمہ پہنچتا ہے۔ چنانچہ ابوجہل اسی چیز پر سب سے زیادہ برافروختہ تھا۔ اور غضبناک ہو کر کہتا ہے

مذہب او قاطع ملک و نسب
از قریش و منکر از فضل عرب
در نگاہ او یکے بالا و پست
با غلام خویش بر یک خواں نشست
احمراں با اسوداں آمیختند
آبروئے دودمانے ریختند

(باقی آئندہ)

لہ الفاروق عمر بحوالہ اسلامی ریاست از مولانا امین احسن اصلاحی

© rasailojaraid.com